(غلام گردش)

پروفیسر سعید احمد سے دوبارہ نہیں ملنا چاہیے!

پنجابی میں فون پر ایک میسج آیا۔ اندازہ ہے کہ میسج انگریزی زبان کا لفظ ہے۔ اسکا اصل ترجمہ پیغام ہے۔ مگر اب یہ لفظ اس درجہ عام ہو چکا ہے کہ اُردو ہمنام لفظ استعمال ہونا مطروق ہو چکا ہے۔ عجیب بات تھی کہ میسج میں درج تھا کہ عظیم صوفی شاعر اور مقامی فلسفی ''میاں محمد بخشؒ'' پر کچھ ضرور لکھوں۔ آخر میں منجانب ''سعید احمد'' درج تھا۔ اس میں کسی قسم کی کوئی خاص بات نہیں تھی۔ شکریہ ادا کر دیا۔ جب اس طرح کا پیغام دو تین مرتبہ آیا تب بھی اندازہ نہ ہو سکا کہ سعید احمد کون ہے۔ ذہن میں کوئی خواہش بھی نہیں تھی کہ اس شخص سے ملا جائے۔ بہر حال میاں محمد بخشؒ کے عظیم مرتبہ پر میرے جیسے طالبعلم کی کوئی بھی بات کرنی محض اور محض عبث ہے۔

چند دن پہلے اسلام آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ ذہن میں آیا کہ ان سے ملنا چاہیے۔ میسج پر درج تھا کہ وہ اسلام آباد کے مکین ہیں۔ ویسے اسلام آباد کو کوشش کے باوجود ایک کامیاب شہر نہیں کہہ سکتا۔ اس ''سرکاری خیمہ'' میں سرکار ہے اور پھر اس سرکار کا ردِعمل ہے۔ بابو ہیں اور ان سے شدید متاثر غیر بابو ہیں۔ کوشش ہوتی ہے کہ جلد از جلد کام ختم کروں اور واپس لاہور کا رخ کر لوں۔ جب لاہور سے نکلا تو سعید احمد کو فون کر دیا کہ شام کو وقت ہو تو ریسٹ ہاؤس آ جائیں۔ ویسے عرصے سے شام کا تصور بھی تبدیل ہو چکا ہے۔ محفلوں سے کافی دور اور کتابوں اور فکر، میری شام کا دوسرا نام ہے۔ فون کرتے وقت قطعاً علم نہیں تھا کہ کتنے بڑے آدمی سے بات کر رہا ہوں۔ ایک نایاب شخص جو معاشروں کو علم کی بنیاد پر ترتیب دینے کی استطاعت رکھتا ہے۔ ریسٹ ہاؤس جا کر ذہن سے بالکل نکل گیا کہ کسی نے آنا ہے۔ تقریباً ساڑھے چھ بجے، سعید صاحب کا فون آیا کہ ریسٹ ہاؤس کے باہر کھڑا ہوں اور چوکیدار کہہ رہا ہے کہ آپ ابھی تک لاہور سے پہنچے نہیں ہیں۔ مگر میں تو کمرے میں ہوں۔ آپ آیئے۔ ذہن میں حد درجہ شرمندگی ہوئی کہ میں ان سے ملاقات کو بھول کیسے گیا۔ تھوڑی دیر بعد، سعید صاحب کمرے میں آ گئے۔ یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی۔

سفید بال، بالکل سفید داڑھی، پینٹ شرٹ اور سوئٹر پہنے ہوئے ایک عام سا آدمی۔ بالکل متاثر نہیں ہو پایا۔ ویسے عجیب اَمر یہ ہے کہ اب لوگوں سے متاثر ہونے کا وصف بھی کھو بیٹھا ہوں۔ اگر کوئی بتائے کہ وہ وزیر یا اہم آدمی ہے تو یقین فرمایئے، دل چاہتا ہے کہ فوراً اس سے کنارہ کشی کی جائے۔ بہر حال اہل ہنر سے ملنے کا شوق ہر وقت دل میں آگ کی طرح موجزن رہتا ہے۔ سعید صاحب نے بولنا شروع کر دیا۔ میں اقتصادیات کا پروفیسر تھا۔ تین دہائیاں راولپنڈی کے ایک کالج میں اقتصادیات پڑھاتا رہا۔ بیس برس پہلے لاہور جانا ہوا تو اپنی بھانجی کو پنجابی میں کہا کہ پانی لے کر آؤ۔ بچی کو سمجھ ہی نہیں آئی کہ میں نے کیا کہا ہے۔ ڈانٹ کر کہا کہ تمہاری ماں نے تمہیں مادری زبان بھی نہیں سکھائی۔ خیر تھوڑی دیر بعد، بہن آئی تو پوچھنے لگی کہ بھائی جان! آپ نے میری بیٹی کو کیا کہا ہے کہ وہ تو روئے جا رہی ہے۔ ہمشیرہ کو واقعہ سنایا تو اس نے کہا کہ، میں اب امریکہ میں رہتی ہوں۔ میرا پنجابی زبان سے کوئی تعلق نہیں۔ ویسے بھی ''پنجابی زبان اب مر چکی ہے''۔ مکالمہ ختم ہو گیا۔ سعید صاحب نے دکھی سے ہو کر کہا کہ میں اسی وقت بس پر جہلم آیا۔ وہ جہلم کے رہنے والے ہیں۔ ایک پرنٹنگ پریس گیا اور انہیں کہا کہ مجھے ایک ہزار پوسٹر بنا کر دو جس میں لکھا ہو کہ پنجابی زبان مردہ نہیں ہے بلکہ زندہ ہے۔ ایک

ہزار پوسٹر بنوا کر لاہور آیا۔ گوند لیکر پوری رات مال روڈ، ہائیکورٹ اور دیگر مقامات پر اشتہار لگاتا رہا۔ کسی نے بھی میرے اشتہار کی تعریف نہیں کی۔ انکی آواز میں دکھ کے ساتھ گلہ بھی موجود تھا۔ لاہور میں جس سے بھی ملا اس نے مجھے حد درجہ غیر سنجیدگی سے لیا۔ بلکہ کئی بڑے نامور لوگوں نے میری حد درجہ تضحیک کی۔

پنڈی واپس آیا تو پنجابی صوفی شعراء کی شاعری میں ڈوب گیا۔ میاں محمد بخش کو پڑھنا شروع کر دیا۔ انکی عظیم شاعری کو روح اور وجدان کا حصہ بنا لیا۔ انکی لازوال مثنوی ''سیف الملوک'' کو اپنے اوپر طاری کر لیا اور آہستہ آہستہ سیف الملوک نے مجھے ہر طرف سے گھیر لیا۔ جتنا پڑھتا تھا، اتنا ہی میاں محمد بخش کا قائل ہوتا جاتا تھا۔ دل میں آئی کہ ہم لوگ، اپنے صوفی شعراء کو تو پڑھتے نہیں، تو کیوں نہ لوگوں کو شعور دیا جائے کہ آؤ اور اپنے لازوال صوفی شعراء کی شاعری کو پڑھو۔ زندگی گزارنے کا شعور اور جذب دریافت کرو۔ سعید صاحب کی باتوں میں حد درجہ انکساری اور سنجیدگی محسوس ہونے لگی۔ کہنے لگے کہ مختلف زبانیں سیکھی ہوئی ہیں۔ جیسے گُرمکھی، ایسپرنٹو (Esperanto)، ترکی اور دیگر بولیاں۔ یہ داستان بھی عجیب ہے کہ صحرانوردی کے شوق نے مجھے اَن گنت زبانیں سیکھنے کا نادر موقع فراہم کر دیا۔ اس وقت اندازہ ہوا کہ سعید صاحب نے تو دنیا کا کونہ کونہ چھان مارا ہے۔ چین سے لیکر رومانیہ تک، نگر نگر علم کی پیاس بجھانے کیلئے بنجارا بنکر گھومتا رہا۔ میں نے سب سے پہلے میاں محمد بخش کی شاعری کا انگریزی، اُردو، پنجابی، گرمکھی میں ترجمہ کر ڈالا۔ ساتھ ساتھ خواجہ غلام فرید، بابا بھلے شاہؒ، وارث شاہؒ، بابا فریدؒ اور شاہ حسین کی شاعری کو بھی اسی طرح مختلف زبانوں میں ترجمہ کرنا شروع کر دیا۔ یہ کام بے حد مشکل تھا۔ بلکہ شروع شروع میں تو ناممکن نظر آتا تھا۔ گھریلو مسائل بھی حل کرنے ہوتے تھے۔ ذمہ داریاں بھی پوری کرنا ہوتی تھیں۔ چنانچہ میں نے تمام جھنجھٹوں کو پورا کرنے کے بعد ایک حد درجہ عجیب وغریب فیصلہ کیا۔ ہاں اس فیصلے سے پہلے، بیوی کو چار مرلے کا گھر بنا کر دیا۔ اسکے بعد، اسلام آباد سے سترہ کلومیٹر دور، چھتر باغ کے نزدیک ایک جنگل میں رہنا شروع کر دیا۔

میں حیرت زدہ رہ گیا۔ سعید صاحب کہنے لگے کہ اب میں جنگل میں رہتا ہوں۔ وہاں میرے پاس پانچ مرلے زمین ہے۔ جس پر ایک کٹیا بنا رکھی ہے۔ جس میں ایک لائبریری اور ایک کمرہ ہے۔ کوئی چار دیواری نہیں۔ میں آزاد فضا میں بیٹھا رہتا ہوں۔ اور پنجابی کے عظیم صوفی شاعروں پر تحقیق کرتا ہوں۔ میرے اردگرد، رنگ برنگ پرندے، طوطے، چڑیاں اور جانور ہوتے ہیں۔ دور دور تک کوئی آواز نہیں ہوتی۔ کوئی مہمان داری نہیں ہوتی۔ کہیں آنا جانا نہیں ہوتا۔ بس میں ہوتا ہوں، کتابیں ہوتی ہیں، قلم اور کاغذ ہوتے ہیں، یکسوئی ہوتی ہے اور کسی خلل کے بغیر اپنا تحقیقی کام جاری رکھتا ہوں۔ ہفتہ میں ایک بار، اسلام آباد آتا ہوں۔ اہلیہ اور بچوں سے ملتا ہوں اور واپس چلا جاتا ہوں۔ اس طرح گھریلو ذمہ داریاں پوری ہو جاتی ہیں اور پھر بڑے آرام سے جنگل میں واپس چلا جاتا ہوں۔

ایک دم ایسے لگا کہ سعید احمد کا قد ہزاروں فٹ لمبا ہے اور میں اسکے سامنے ایک بونا بن چکا ہوں۔ میرے ذہن کے ہر خلیہ نے بار بار سوال کرنا شروع کر دیا۔ یہ سعید احمد اتنا عجیب شخص کیسے ہے۔ دنیاداری کو لات مار کر اپنے آپکو علم کی ترویج کرنے کیلئے کیسے وقف کر رکھا ہے۔ اتنا مشکل کام کیسے سرانجام دیا۔ یہ کوئی معمولی آدمی نہیں کر سکتا۔ یہ بہت بڑے آدمی کا کام ہے۔ بڑے نہیں، بلکہ ایک انتہائی عظیم شخص کا کارنامہ ہے۔ سوچ ہی رہا تھا کہ سعید صاحب نے ایک تھیلہ میرے حوالے کر دیا۔ اس میں مختلف کتابیں تھیں۔ انیس سے بیس

کتابیں۔ یہ پنجابی صوفی شعراء کا کلام تھا اور سعید احمد کا مختلف زبانوں میں ترجمہ تھا۔ کتابیں اور کام دیکھ کر یقین فرمایئے، کہ ششدر رہ گیا۔ اتنا زیادہ کام۔ اس درجہ محنت۔ ایک آدمی اپنی مختصر زندگی میں یہ سب کچھ کیسے کر سکتا ہے۔ مگر اس مردِ عجیب نے یہ کام کر کے دکھایا ہے۔ جب میں نے سعید صاحب سے انکے کام کی تعریف کی تو وہ عاجزی سے کہنے لگے کہ یہ تو کچھ خاص نہیں ہے۔ انہوں نے بات ہی بدل دی۔ بڑے آدمی کی اصل نشانی ہے یہ، کہ وہ اپنے علمی، ادبی، تحقیقی، سیاسی، کسی بھی کام پر اتراتا نہیں، خاموش رہتا ہے۔ ورنہ ہمارے ہاں تو، دو چار کتابیں پڑھ کر لوگ اپنے آپکو عالم سمجھنا شروع ہو جاتے ہیں۔ بلکہ یہی نہیں، دوسروں کو جاہل گردانا شروع ہو جاتے ہیں۔ بہر حال سعید صاحب نے ایک لفظ بھی ایسا نہیں کہا جس سے علمی تکبر جھلکتا ہو۔

ویسے پڑھنے کے علاوہ کیا کرتے ہیں۔ اس سوال کا جواب بھی حد درجہ خوبصورت تھا۔ میں پنڈی کی ایک دکان سے باجرہ اور دانے خریدتا ہوں اور پرندوں کو ڈالتا ہوں۔ میری کٹیا کے اردگرد، پرندوں کے غول کے غول جمع ہو جاتے ہیں۔ اس میں ایسے خوبصورت پرندے بھی ہوتے ہیں جو کہیں بھی دیکھنے میں نہیں آتے۔ ہاں، ایک چڑا وہاں آتا ہے۔ اس کی ٹانگیں نہیں ہیں۔ وہ اپاہج ہے۔ وہ بڑے اطمینان سے میرے قریب فضا سے اُترتا ہے۔ عجیب طریقے سے دانہ چگتا ہے۔ دائیں اور بائیں مڑ کر کھاتا ہے۔ کیونکہ وہ سیدھی سمت میں چونچ استعمال نہیں کر سکتا۔ دو تین دن سے آیا نہیں۔ میں اسکے متعلق کافی پریشان ہوں۔ سعید صاحب بولتے چلے گئے اور میں حیرت سے پتھر کا ہوتا چلا گیا۔

وقت کیسے گزرا، معلوم ہی نہیں ہو سکا۔ انکے کیری ڈبے تک چھوڑنے گیا تو انہوں نے ایک انتہائی مٹے ہوئے آدمی سے ملاقات کروائی۔ یہ ایک مقامی دربار کے درویش ہیں۔ میں آج انہیں اپنی جھونپڑی میں لیکر جا رہا ہوں۔ پر آپ انہیں کمرے میں لے آتے۔ میرے سوال کا انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شائد آزاد لوگوں کا پتھروں اور سیمنٹ کی غاروں میں رہنے سے دم گھٹتا ہے۔ بہر حال، ابھی تک حیرت میں ہوں۔ شدید سوچ میں ہوں۔ یہ سعید احمد اصل میں کون ہے۔ یہ جنگل میں کیسے رہتا ہے۔ یہ اتنا علمی کام کیسے کر لیتا ہے۔ اسے پرندوں سے اتنا شغف کیوں ہے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ میرے پاس کسی سوال کا جواب موجود نہیں ہے! میرا خیال ہے کہ مجھے پروفیسر سعید احمد سے دوبارہ نہیں ملنا چاہیے!

راؤ منظر حیات